203

تہذیب وفن

اقبال کا نظریۂ فن

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006
اقبال اکادمی پاکستان

پروفیسر حسن شاہنواز زیدی

تہذیب و فن

اقبال کا نظریۂ فن

پروفیسر حسن شاہنواز زیدی

پتھر کے زمانے کا ایک وحشی قبیلہ ہاتھوں میں نوکیلے پتھر تھامے، دل میں جذبۂ حیات پروریے، دائرے کی شکل میں محوِ رقص ہے۔ یہ بیالے شکاریوں کا ایک گروہ ہے جو التامیرا کے جنگلوں میں وحشی درندوں سے مقابلے کی تیاری کر رہا ہے۔ شکار سے پہلے یہ ٹولہ دوبارہ غار کے دہانے میں داخل ہوگا جہاں ان کا سردار ساحر، جادوگر، آرٹسٹ اپنے کمالِ ہنر سے جو سحر کا درجہ رکھتا ہے، غار کی دیوار پر مستقبل قریب میں شکار ہونے والے جانور کے سائے کو قابو میں کر رہا ہے۔[1]

دوڑتے ہوئے بیل کی شبیہ مکمل ہوتی ہے۔ جادوگر فن کار اس پر سرخ مٹی سے ان مقامات کی نشاندہی کرتا ہے جہاں شکار کے وقت ضرب کاری لگے گی۔

پورا گروہ ایک فلک شگاف نعرہ لگاتا ہے۔

اب انشاءاللہ یہ جانور ان کے قبضے میں ہوگا!

فن برائے زندگی کا آغاز ہو چکا ہے۔

ابھی شام ایک شکاری اور اس کی بیوی غار کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ معاً ان کی نظر ایک چمکدار پتھر پر پڑتی ہے۔ شکاری اسے اٹھا لیتا ہے۔ کچھ دیر الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد وہ اسے پھینکنے ہی والا تھا کہ پتھر اس کی بیوی چھین لیتی ہے۔ اس پتھر کی گولائی میں اسے انسانی جسم کی مماثلت نظر آتی ہے۔ وہ پتھر گھر لے جاتی ہے غار کے ایک کونے میں اس نے پہلے سے جمع کیے ہوئے پتھر اور سیپیوں کے ٹکڑے سجا رکھے ہیں۔ اس کے گال اور ہاتھوں کی پشت پہلے ہی رنگین مٹی سے منقش ہیں۔

فن برائے فن بھی ازل سے انسان کی فطرت کا ایک حصہ ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ فن برائے فن اور فن برائے زندگی کی بحث اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ خود انسان!

فن، جب افراد، معاشرے اور زندگی کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کرتا ہے تو فن برائے زندگی کہلاتا ہے اور جب انسان کے حسِ جمالیات کی تسکین کا موجب بنتا ہے تو فن برائے فن۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان دونوں نظریوں میں توازن برقرار نہیں رہتا۔

کبھی فن برائے زندگی میں مقصدیت کا پہلو بڑھ کر محض ایک پراپیگنڈہ یا اشتہار سازی بن کر رہ جاتا ہے، جیسا کہ قدیم مصری تہذیب میں مختلف فرعونوں کے دور میں ہوا۔ جب آرٹ صرف فرعونوں کے مقبروں کی آرائش کے کام آتا رہا، اور کبھی صرف امرا اور اہلِ دربار کی خوشامد کا ذریعہ بن کر رہ جاتا رہا۔ اور صرف غلامی اور حیات کش جذبات و خیالات کی تبلیغ کے لیے استعمال ہوتا رہا۔ مشرق و مغرب کی کتنی ہی صدیاں ایسے حیات دشمن فنون سے بھری پڑی ہیں۔

کبھی فن برائے فن عقل و فہم اور اخلاقیات کے تمام ناطے توڑ کر مادر پدر آزاد ہو جاتا ہے، جیسا کہ بیشتر مغربی مصوری اور بالخصوص ڈاڈا کی تحریک میں ہوا۔

ایسی حالت میں آرٹ کے موضوعات صرف جنس، عورت، پریشان خیالی، ہیئت کی بے ربطی اور تجرید کے گنجلک نظریے ہوتے ہیں۔

دونوں حالتوں میں فن زندگی کی روشن حقیقتوں اور بلند مقاصد سے کٹ کر رہ جاتا ہے لہٰذا اقبال سا مفکر اس صورتحال کا سامنا کرتا ہے تو سراپا احتجاج بن جاتا ہے ؎

گر ہنر میں نہیں تعمیر خودی کا جوہر
وائے صورت گری و شاعری و نائے و سرود [۱۳]

افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں
بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز
وہ ضرب اگر کوہ شکن بھی ہو تو کیا ہے
جس سے متزلزل نہ ہوئی دولتِ پرویز [۱۴]

اقبال اور فن برائے فن

جمالیات اور فنونِ لطیفہ کا تعلق انتہائی گہرا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق:

"تخلیقِ حسن کا دوسرا نام آرٹ ہے۔ فنونِ لطیفہ کے حوالے سے حسن کی یہ

All rights reserved 2002-2006

تخلیق اگر خشت و سنگ کے وسیلے سے ظاہر ہو تو اس کا نام فنِ نقش گری یا فنِ تعمیر، خطوط اور رنگوں کے ذریعے ہو تو فنِ مصوری، بدن کے لوچ یا حرکات و سکنات کی مدد سے ہو تو فنِ رقص، صوت و زخمہ کے توسط سے ہو تو فنِ موسیقی اور حروف و الفاظ کی مدد سے ہو تو ادب ہوگا اور اگر ادب میں صوت و صورت کی وہ صفات بھی شامل ہو جائیں جن کا تعلق موسیقی و مصوری سے ہے تو پھر تخلیقِ حسن کا یہ عمل فنِ شاعری کہلائے گا۔ [۱۲]

حسن کے بارے میں مختلف مکتبۂ فکر موجود ہیں۔ کچھ لوگ اسے صفت بالذات قرار دیتے ہیں اور اسے مطلق نیکی، سچائی، خیر اور دوسرے لفظوں میں ذاتِ مطلق سے منسلک کرتے ہیں۔

بعض حکماء کا خیال ہے کہ وہ حسنِ خارج پر نظر ڈالنے والوں کی ذاتی اور داخلی کیفیت ہے۔ یعنی حسن دیکھنے والے کی نگاہوں میں ہوتا ہے جبکہ ایک تیسرا نظریہ ان دونوں نظریات کے بین بین ہے۔ یعنی حسن کا تعلق نہ مکمل طور پر خارج سے ہے اور نہ داخل سے بلکہ خارجی مشاہدے سے اگر انسان کی روح و باطن میں ایک تموّج پیدا ہو اور پیغامِ نشاط دے تو وہ جذبۂ حسن کہلاتا ہے ؎

محفلِ قدرت ہے اک دریائے بے پایانِ حسن
آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حسن
حسن کوہستاں کی ہیبت ناک خاموشی میں ہے
مہر کی ضو گستری، شب کی سیہ پوشی میں ہے
آسمانِ صبح کی آئینہ پوشی میں ہے یہ
شام کی ظلمت، شفق کی گل فروشی میں ہے یہ
عظمتِ دیرینہ کے مٹتے ہوئے آثار میں
طفلکِ ناآشنا کی کوششِ گفتار میں
ساکنانِ صحنِ گلشن کی ہم آوازی میں ہے
ننھے ننھے طائروں کی آشیاں سازی میں ہے
چشمۂ کہسار میں، دریا کی آزادی میں حسن
شہر میں، صحرا میں، ویرانے میں، آبادی میں حسن [۱۳]

فنونِ لطیفہ اور حسن کے اس مربوط تعلق کی بنا پر بعض فنکاروں اور مفکرین نے انتہا پسندی کی روش اختیار کی اور حسن ہی کو فن کا نصب العین سمجھنے لگے۔ افلاطون نے چونکہ اپنی "ری پبلک" میں فن اور فنکاروں کی کاملاً تکذیب کی تھی اور فن میں مقصدیت کے پہلو کو غیر معمولی اہمیت دے دی تھی اس لیے ردِ عمل کے طور پر ارسطو نے فن کو اخلاق کی بندشوں سے بلند قرار دے دیا اور پہلی مرتبہ یہ نظریہ[۲۵] وجود میں آیا کہ فن کا اپنا ہی ایک معیار ہے، جو اخلاقیات کی قید میں نہیں آسکتا۔

اٹھارویں صدی میں ایک مفکر وکو' ارسطو کی حمایت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

"شاعری کے لیے حقیقت اور صداقت ضروری نہیں بلکہ شاعری اور آرٹ مبالغے کے جتنا نزدیک ہوں گے، اتنا ہی پُر اثر ہوں گے اور یہی بات انہیں فلسفے سے ممیز کرتی ہے"۔

جرمن عالمِ جمالیات فشر (۱۸۰۷ - ۸۷ء Frederick T Vischer) اور ولندیزی عالمِ جمالیات اپذومر Opzoomer فن کا مقصد تخلیقِ حسن کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں فن اور حسن یقیناً نیکی کی معاونت کرتے ہیں لیکن ایک غلام کی حیثیت سے نہیں ہے۔

اطالوی فلسفی کروچے (۱۸۶۶ء - ۱۹۵۲ Croce) نے "اظہاریت کے نظریۂ فن کی پیش کش" میں اس امر کا اظہار کیا کہ:

"تخلیق، فن کار کی دماغی کاوش اور ارادے کے بغیر خود بخود اس سے صادر ہوتی ہے اس لیے فن تخلیقی فعلیت کی حیثیت سے نہ تو کوئی مقصد رکھتا ہے اور نہ اپنی مرضی سے مواد یا موضوع کا انتخاب کرسکتا ہے"۔

بقول اس کے شاعری قلب کی ابتدائی صورت ہے، عقل سے پہلے اور استدلال سے آزاد۔

کروچے نے فلسفۂ اظہاریت کو چار حصوں میں تقسیم کیا:

۱۔ فن ایک ایسی فعالیت ہے جو خود مختار ہے اور اخلاق کی ہر قسم کی پابندی سے بے نیاز ہے۔

۲۔ یہ فعالیت، عقلی فعالیت سے بالکل مختلف ہے۔

۳۔ یہ فنکار کی ذات کے پیچ و خم کو نمایاں کرتی ہے۔

۴۔ اس کی تحسین کا باعث دیکھنے یا سننے والے کے ذہن میں فنکار کے ہی تجربے کا ازسرِ نو زندہ ہو جانا ہے[۲۶]۔

اقبال اگرچہ دوسری باتوں سے جزوی طور پر متفق ہیں لیکن پہلے نقطے کے سخت مخالف ہیں۔ وہ اس سلسلے میں کہتے ہیں:

"قوموں کے اخلاق کو خراب کرنے والی چیزوں میں سے ایک نہایت خطرناک بلکہ مہلک وہ نظریہ ہے جسے فن برائے فن کہتے ہیں۔ اس نظریہ سے مراد یہ ہے کہ جمالیات کا ہر شعبہ یا فن صرف اپنے اصولوں کو ہی اپنا معیارِ صحت اور نصب العین قرار دے۔ اپنے ان اصولوں سے باہر کوئی اصول (مثلاً اخلاقیات یا روحانیات کا کوئی اصول) اس فن کی راہبری کا حق دار نہ ہو۔ وہ فن خود اپنا راہبر ہو۔ اس کی ترجیح یا ترتیب یا اس کا ارتقا کسی فوق الفن اصول کے ماتحت نہ ہو وغیرہ۔

مقصد یہ کہ حسن خود اپنا معیار ہے اور اپنے سے بالاتر کسی معیار یا مدعا یا نصب العین کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔

یہ نظریہ آجکل مغربی دنیا میں بہت مقبول ہے اور اس کی مقبولیت کی رفتار اگر اسی طرح بڑھتی رہی تو مجھے یقین ہے کہ ان اقوام کو گرا کر رہے گا۔ میں نے اپنے کلام میں اس مہلک نظریے کے خلاف جہاد کیا ہے اور میں نوجوانوں کو متنبہ کرتا ہوں کہ اس خطرناک غلطی میں نہ پڑنا۔ فن اخلاقیات اور حیاتیات سے علیحدہ ہوتا ہے تو وہ بہت جلد مخرب الاخلاق بن جاتا ہے۔ اعلیٰ مقاصد کی تکمیل و پیروی کے لیے جمالیات کے کسی فن کو لوگے تو وہ اپنے بہترین مدارج طے کرے گا اور اپنی قوم و ملت میں ایک نئی روح پھونک دے گا لیکن وہی فن جب اپنے مقاصد سے بچھڑ جائے گا تو قوم و ملت کے حق میں زہرِ قاتل بنے گا۔"[۹]

اپنی شاعری میں وہ جابجا انہیں خیالات کا اظہار کرتے ہیں ؎

یوں تو روشن ہے مگر سوزِ دروں رکھتا نہیں
شعلہ ہے مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ترا

قیس پیدا ہوں تری محفل میں یہ ممکن نہیں
تنگ ہے صحرا ترا، محمل ہے بے لیلیٰ ترا

اپنے دور کی شاعری، ادب اور بالخصوص مصوری کا نقشہ کھینچتے ہوئے اقبال کہتے ہیں ۔

موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار
چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ، بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ، بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

فنِ مصوری کے موضوعات خیام کی شاعری کے زیرِ اثر جو مناظر پیش کر رہے تھے اس کے بارے میں علامہ لکھتے ہیں ۔

ہمچناں دیدم فنِ صورت گری
نے براہیمی درو نے آذری
راہبے در حلقۂ دامِ ہوس
دلبرے با طائرے اندر قفس
خسروے پیشِ فقیرے خرقہ پوش
مردِ کوہستانی، ہیزم بدوش!
نازنینے در رہِ بُت خانہ است
جوگیے در خلوتِ ویرانہ است
پیر کے از دردِ پیری داغ داغ
آنکہ اندر دستِ او گل شد چراغ
نوجوانے از نگارِ خوردہ تیر
کودکے بر گردنِ بابائے پیر"
مے چکد از خامہا مضمونِ موت
ہر کجا افسانہ و افسونِ موت

زندگی اور حرارت سے عاری یہ موضوعات عشق و عاشقی، عیاشی اور راہبانہ روش کے نمائندہ تھے۔
لیکن آج کے دور کے مشرقی مصور جو محض قدرتی مناظر کی تصویر کشی کر رہے ہیں، ان کے بارے میں علامہ

کیا کہتے ہیں ؎

از خودی دور است و رنجور است و بس!
رہبرِ او ذوقِ جمہور است و بس!
حسن را دریوزہ از فطرت کند
راہزن وا راہ تہی دستے زند!
حسن را از خود بروں جستن خطاست
آنچہ مے بالیست پیشِ ما کجاست
نقش گر خود را چو با فطرت سپرد
نقشِ او انگند و نقشِ خود سترد

اس حسن کا کیا فائدہ جس سے زندگی کی کشمکش کا مقابلہ نہ کیا جا سکے اور جو محض عام ہیں سستی مقبولیت کے باعث ظہور پذیر ہو۔ علامہ اقبال کو حسن کی افادیت سے کبھی انکار نہیں رہا لیکن وہ اسے زندگی بخش جذبوں کے فروغ کے لیے استعمال ہوتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔

قدرتی مناظر کی تصویر کشی کے متعلق بشیر محمد اقبال کے نظریۂ فن سے یہ نتیجہ نکالتی ہیں کہ:

"محض دریاؤں کی روانی، گلوں کی شادابی، شبنم کی سیرابی، شفق کی سرخی، اور فطرت کی بوقلمونی کا حسن رکھنے والا فن شائقین میں سرور اور مدہوشی کی ایک کیفیت پیدا کرتا ہے۔ ایسے فن سے فن کار کے کسی اعلیٰ جذبے کا اظہار نہیں ہوتا اور نہ ہمارے دل و دماغ کو کوئی اعلیٰ تحریک ملتی ہے۔"[۹]

فن اور مقصدیت

فن کو عام طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱۔ فنونِ مفیدہ اور
۲۔ فنونِ لطیفہ

فنونِ مفیدہ میں تمام وہ فنون شامل ہیں جن سے عام زندگی میں افادہ حاصل کیا جاتا ہے۔ مثلاً ظروف سازی، فرنیچر سازی، صنعتی فنون، لباس سازی، گھروں کی آرائش کا فن، زیور سازی اور دھات کا ساز و سامان بنانے کے فنون وغیرہ ــــــ جبکہ فنونِ لطیفہ وہ فنون ہیں جو تخلیقِ حسن سے متعلق ہیں، ان میں شاعری اور ادب، مصوری

اور سنگ تراشی، رقص و موسیقی اور فنِ تعمیر شامل ہیں۔

پروفیسر گڈہارٹ رنڈل کے الفاظ میں:

"فنونِ لطیفہ اگرچہ ہمیں فائدہ بھی پہنچا سکتے ہیں لیکن فنونِ لطیفہ کو ہمیں محظوظ ضرور کرنا چاہیے، اس کے برخلاف فنونِ مفیدہ ہمیں محظوظ کر سکتے ہیں لیکن انہیں فائدہ ضرور پہنچانا چاہیے۔"[۱۱۵]

صنعتی انقلاب کے بعد رسکن، کروچے، اسپنسر، شوپنہار اور دوسرے مفکرین نے فنونِ مفیدہ اور فنونِ لطیفہ کی مختلف تعریفیں کی ہیں لیکن ان کا بنیادی فرق ان فنون کے نام سے ظاہر ہے۔ مثال کے طور پر تصویر سے کوئی طبعی کام نہیں لیا جا سکتا۔ البتہ ایک کرسی سے لیا جا سکتا ہے۔ طبعی مقصدیت کے اعتبار سے تو تصویر صرف دیوار پر کسی بدنما روشندان کو چھپانے کا کام کر سکتی ہے لیکن یہ مصوری کا بدترین استعمال ہوگا۔

مشہور انگریز مصور اور عالمِ جمالیات سر رینالڈ نے اٹھارہویں صدی میں پہلی بار اس بات کا احساس دلایا کہ فن کے اصلی مخاطب، تخیل کو متاثر کرنا ہے۔ اس سے پہلے کے عالمِ جمالیات فن کو محض حسن کے اظہار کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔

فنونِ لطیفہ میں تخیل اور احساس کو متاثر کرنے کی صلاحیت فطرتاً موجود ہے۔ انسان کے بچے آغاز ہی میں اچھی آواز اور دلکش رنگوں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ انسان تو کیا جانوروں پر بھی موسیقی کا اثر ہوتا ہے اور اب تو یہ بات تجربوں سے ثابت ہو چکی ہے کہ نباتات اور پودے بھی موسیقی سے متاثر ہوتے ہیں۔

فنونِ لطیفہ کی اسی قوتِ اثر کی بدولت فنکاروں پر کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ ان ذمہ داریوں کا سب سے پُرزور مبلغ افلاطون تھا۔ کیونکہ اہلِ ایتھنز پر ان سے زیادہ جنگ کش قوم سپارٹا نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس لیے افلاطون کی مثالی ریاست ایک عسکری معاشرے کا خواب تھا۔ علی عباس جلالپوری "روایاتِ فلسفہ" میں لکھتے ہیں:

"اس کی مثالی ریاست میں اشتمالیت اور اباحتِ نسواں کے تصورات ملتے ہیں۔ افلاطون کہتا ہے کہ اس ریاست میں املاک کے ساتھ عورتوں کا بھی اشتراک ہوگا۔ کمزور اور ناقص الاعضاء بچوں کو پیدا ہوتے ہی تلف کر دیا جائے گا۔ کوئی شخص کسی شے کو ذاتی ملک نہیں سمجھے گا۔ تمام شہریوں کے روٹی، کپڑے، رہائش اور علاج معالجے کی کفالت سرکار کرے گی۔ بچے گھروں کی بجائے سرکاری درسگاہوں میں رہیں گے۔ . . . . موسیقی کی بھی تعلیم دی جائے گی لیکن اس میں ایسے نغمات نصاب سے خارج کر دیے جائیں گے جو جذبات میں نفسانی ہیجان پیدا

کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ طلبا کو کڑی فوجی تربیت دی جائے گی۔"[۱۲۵]

افلاطون کی ریاست میں شاعروں اور مصوّروں کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ کیونکہ اس کے خیال میں وہ نقل کی نقل کرتے ہیں ۔ وہ فن کو شعبدہ بازی ، نقالی اور کھیل تماشا سمجھتا ہے اور اسے مضرت رساں مخربِ اخلاق اور قابلِ تحقیر گردانتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے کا فن افلاطون کے تصوّرِ مقصدیت پر پورا نہیں اترتا۔

اقبال اس معاملے میں افلاطون کے پیروکار نہیں ۔ اگرچہ وہ فن برائے فن کے شدید مخالف ہیں؛ لیکن وہ فنونِ لطیفہ کو رد نہیں کرتے ۔ وہ فنون کی عظمت کے قائل ہیں اور اس کو ایک بھرپور اور بامعنی زندگی کی تشکیل کا ذریعہ دیکھنا چاہتے ہیں ۔

قوم گویا جسم ہے ، افراد ہیں اعضائے قوم
منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفلِ نظمِ حکومت ، چہرۂ زیبائے قوم
شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ[۱۲۶]

سرود و شعر و سیاست ، کتاب و دین و ہُنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
ضمیرِ بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی
بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ[۱۲۷]

فنونِ لطیفہ کی عظمت کا اعتراف کرنے کے بعد وہ اس کے بلند مقاصد کی نشاندہی کرتے ہیں ۔

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک اُمتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ[۱۲۸]

اسی لیے وہ افلاطون کے نظریے کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

راہبِ دیرینہ، افلاطوں حکیم
از گروہِ گوسفندانِ قدیم

اقبال فن برائے زندگی کے داعی ہیں اور مسلمان بے مقصد زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا، اس لیے وہ فن میں مقصدیت کا، جب بھی ذکر کرتے ہیں، ان کی مراد زندگی اور آرٹ کے باہمی تعلق سے ہوتی ہے۔ وہ فن میں مقصدیت برائے مقصدیت کے حامی نہیں کیونکہ اس طرح فن صرف ایک پراپیگنڈہ اور خشک چیز بن کر رہ جاتا ہے جو اپنی تاثیر سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور زندگی کے کسی کام نہیں آسکتا۔

فن برائے زندگی

علامہ نے جب بھی فن پر اظہارِ خیال کیا، فن برائے زندگی کی وضاحت اور حمایت کی۔ یہاں ہم ان کے نظریۂ فن برائے زندگی سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں:

"مجھے جو کچھ کہنا ہے اس کا حاصل بس اس قدر ہے کہ میں سارے فنونِ لطیفہ کو زندگی اور خودی کے تابع سمجھتا ہوں۔ عرصہ ہوا، میں نے اس باب میں اپنے نکتۂ نظر کا اظہار ۱۹۱۴ء میں اپنی مثنوی اسرارِ خودی میں کیا تھا۔ اس کے تقریباً بارہ سال بعد زبورِ عجم کی آخری نظم بھی اسی زاویۂ نگاہ کی ترجمان ہے۔ میں نے اس نظم میں ایک ایسے صاحبِ فن کی معنوی تحریک کا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی تھی جس کے اندر محبت، جلال اور جمال کی جامعیت کی صحت میں ظہور پذیر ہوتی ہے ؎

دلبری بے قاہری، جادوگری است؛
دلبری با قاہری، پیغمبری است

جہاں تک اسلام کی تہذیبی تاریخ کا تعلق ہے، میرا عقیدہ یہ ہے کہ سوائے فنِ تعمیر کے استثنا کے اسلامی فنونِ لطیفہ موسیقی، مصوری بلکہ کسی حد تک شاعری بھی ہنوز ظہور کے طالب ہیں۔"[۱۷]

علامہ نے ایک ملاقاتی خواجہ عبدالوحید سے فرمایا:

"اگرچہ آرٹ کے متعلق دو نظریے موجود ہیں۔ اوّل یہ کہ آرٹ کی غرض محض حسن کا احساس پیدا کرنا ہے اور دوم یہ کہ آرٹ سے انسانی زندگی کو

فائدہ پہنچنا چاہیے۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ آرٹ زندگی کے ماتحت ہے۔ ہر چیز کو انسانی زندگی کے لیے وقف ہونا چاہیے اور اس لیے ہر وہ آرٹ جو انسانی زندگی کے لیے مفید ہو، اچھا اور جائز ہے اور جو زندگی کے خلاف ہو، جو انسانوں کی ہمتوں کو پست اور ان کے جذباتِ عالیہ کو مردہ کرنے والا ہو، قابلِ نفرت و پرہیز ہے اور اس کی ترویج حکومت کی طرف سے ممنوع قرار دی جانی چاہیے۔[۶]

زندگی کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

اپنی دنیا آپ پیدا کر، اگر زندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے، ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی
آشکارہ ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

فنکار سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے
افلاک منور ہوں ترے نورِ سحر سے
دریا متلاطم ہوں تری موجِ گہر سے
شرمندہ ہو فطرت ترے اعجازِ ہنر سے
اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

اقبال نے "انجمنِ ادب کابل، افغانستان" سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"میرا یہ عقیدہ ہے کہ آرٹ یعنی ادبیات یا مصوری یا موسیقی یا معماری، جو بھی ہو، ہر ایک زندگی کی معاون اور خدمت گار ہے اور اسی بنا پر آرٹ کو چاہیے کہ میں ایجاد کہوں نہ کہ تفریح۔۔۔۔ اس ملک کے شعراء پر

لازم ہے کہ وہ نوجوان قوم کے لیے سچے رہنما بنیں۔ زندگی کی عظمت و بزرگی کے بجائے موت کو زیادہ بڑھا کر نہ دکھائیں کیونکہ آرٹ جب موت کا نقشہ کھینچتا ہے اور اس کو بڑھا کر دکھاتا ہے، اس وقت وہ سخت خوفناک اور برباد کن ہو جاتا ہے اور جو حسن قوت سے خالی ہو، وہ محض ایک پیغامِ موت ہے۔

دلبری بے قاہری جادوگری است
دلبری با قاہری پیغمبری است[۱۸]

پروفیسر عزیز احمد اس کی تشریح یوں کرتے ہیں:

"دلبری بے قاہری میں فن سے جو جمال پیدا ہوتا ہے، وہ مقصود بالذات اور اس سے جو اثر پیدا ہوتا ہے، وہ کافی بالذات ہے۔ نہ اس میں کوئی افادیت ہے نہ کوئی طاقت اور نہ کوئی حرکت۔"[۱۹]

اقبال، سید سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کبھی میرا مطمعِ نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس! اس بات کو مدِ نظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں، ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب ہے کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔ اس واسطے کہ آرٹ غایت درجہ کی جانکاہی چاہتا ہے اور یہ بات موجودہ حالات میں میرے لیے ممکن نہیں۔"[۲۰]

اقبال جس معاشرے کی تشکیل کے لیے سرگرمِ عمل تھے اس میں انگریزوں کی غلامی اور پھر اس پر رضامندی مسلمانوں کی معاشی حالت، برصغیر کی بدلتی ہوئی صورتِ حال، ہندوؤں کی ریشہ دوانیاں، اتحاد و یگانگت کی ضرورت اور مستقبل کے اندیشے بھی شامل تھے۔ ایسے حالات میں بھی جب ہمارے فن کار مغربی فنون کی اندھی تقلید میں لگے ہوئے تھے تو ان سے کیا توقع کی جا سکتی تھی۔

کس درجہ یہاں عام ہوئی مرگِ تخیل
ہندی بھی فرنگی کا مقلد، عجمی بھی

مجھ کو تو یہی غم ہے کہ اس دور کے بہزاد
کھو بیٹھے ہیں مشرق کا سرودِ ازلی بھی
معلوم ہیں اے مردِ ہُنر تیرے کمالات!
صنعت تجھے آتی ہے پرانی بھی نئی بھی
فطرت کو دکھایا بھی ہے، دیکھا بھی ہے تو نے
آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

اقبال کے نزدیک حیات عمل اور حرکت کا نام ہے، خودی کی پہچان مقصدِ حیات ہے، بوفن زندگی اور عمل کا دشمن ہو، وہ کس طرح جائز قرار دیا جا سکتا ہے ؎

نہ میرے ذکر میں ہے صوفیوں کا سوز و سرور
نہ میرا فکر ہے پیمانۂ ثواب و عذاب
خدا کرے کہ اسے اتفاق ہو مجھ سے
فقیہِ شہر کہ ہے محرمِ حدیث و کتاب
اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب

○

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ
یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ!

○

اے اہلِ نظر، ذوقِ نظر، خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا

مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

اقبال فنکار کو ایسے ادراک کا مالک سمجھتے ہیں جو محض سطحی نگاہوں سے دنیا کو نہ دیکھتا ہو بلکہ ظاہر سے بڑھ کر [illegible] کی اصلیت پر نظر رکھے۔ نہ اقبال وقتی ابال اور جوش کو حرارت پرور فن سمجھتے ہیں۔ وہ تو اس معجزہ فن کے متلاشی ہیں جو دلوں میں مستقل سوز و ساز پیدا کر سکے اور اعلیٰ مقصدِ حیات کی تکمیل اور پیروی میں معاون ہو سکے

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم
گزر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم

اقبال حرکت و عمل، معرفتِ خودی اور عشق کو زندگی کی علامات سمجھتے ہیں ؎

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی!

پروفیسر سعید احمد رفیق لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ فن کی ابتدا بھی زندگی ہے اور انتہا بھی زندگی۔ وہ زندگی سے نکلتا ہے، زندگی اسے پروان چڑھاتی ہے اور زندگی میں مدغم ہو جانا اس کا کمال ہے۔ فن زندگی کا پردہ ہے، عکاس، نقاد اور رہبر ہے۔ یہ زندگی تغیر پذیر بلکہ ترقی پذیر ہے اور جدلیاتی اصول کے تحت آگے بڑھتی ہے۔ یہ انفرادی نہیں بلکہ سماجی ہے۔ یہ راز نہیں بلکہ ذوقِ پرواز ہے جو گردشِ پیہم سے پختہ تر ہے۔ جو جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے۔ جو جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے جو آزادی میں ایک بحرِ بیکراں ہے اور بندگی میں جوئے کم آب، جو عناصر میں ظہورِ ترتیب کا نام نہیں بلکہ ظ

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

"ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی"

زندگی کی راہِ ترقی میں کچھ چیزیں سدِ راہ ہیں اور کچھ اسے تیز کرنے میں معاون و مددگار۔ کچھ زندگی کی دشمن ہیں اور کچھ دوست۔

فن اور ادب کا کام اصولِ زندگی اور اصولِ ترقی کو سمجھنا اور سمجھانا، ترقی کے لیے دل میں لگن پیدا کرنا، زندگی کے دشمن اور دوست میں تمیز کرنا، ایک سے خبردار کرنا اور دوسرے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دینا اور اس طرح زندگی کو آگے بڑھانے میں مدد دینا ہے۔[۲۰]

اقبال اس بات کے حامی ہیں کہ فن کو زندگی کی ضرورت ہے اور زندگی کو فن کی۔ نہ زندگی فن کو چھوڑ سکتی ہے نہ فن زندگی کو۔ اگر فن زندگی سے قطع تعلق کر لے تو فن اپنی موت آپ مر جائے گا اور اگر زندگی فن سے خالی ہو جائے تو وہ بے کیف، پست، حقیر، خشک اور کرخت ہو کر موت بن جائے گی۔ فن جذبات کو جلا دیتا ہے اور انسان کو صفاتِ الٰہی بخشتا ہے ؎

ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دلِ بے نیاز

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
قطرۂ خونِ جگر سل کو بناتا ہے دل
خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود

مختصراً اقبال کا نظریۂ فن یوں بیان کیا جا سکتا ہے ؎

میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن
یہ نکتہ ہے تاریخِ امم جس کی ہے تفصیل
وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل

اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے خلیفہ عبدالحکیم کہتے ہیں:

"جبریل کے مقابلے میں اسرافیل کا کام ایسا صور پھونکنا ہے جس سے پہلا تمام نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے، تمام زندہ ہستیاں موت سے لرزاں ہوں اور تمام مردے قبروں سے نکل پڑیں۔

قیامت سے بڑھ کر انقلابِ عظیم اور کونسا ہو سکتا ہے۔ قیامت کی ماہیت خدا ہی کو معلوم ہے لیکن بہر حال وہ حیات و موت کا ایک انقلابی تصور ہے۔ اقبال کے نزدیک حیاتِ ابدی میں دونوں پہلو بیک وقت موجود ہیں — وہ "الآن کما کان" بھی ہے اور "کل یوم ھو فی شان" بھی۔ میں افزائش بھی حیاتِ ابدی کا وظیفہ ہے۔"[۲۱]

فنِ شاعری میں تو خیر اقبال خود اپنے خواب کی تعبیر ہیں لیکن فنِ موسیقی اب تک اس مردِ خدا کی متلاشی ہے جو اقبال کے الفاظ میں ؎

جس کی تاثیر سے آدم ہو غم و خوف سے پاک!
اور پیدا ہو ایازی سے مقامِ محمود!
مہ و انجم کا یہ حیرت کدہ باقی نہ رہے!
تو رہے اور تیرا نزمۂ لا محدود!
جس کو مشرع سمجھتے ہیں فقیہانِ خودی
منتظر ہے کسی مطرب کا ابھی تک وہ سرود

حواشی:

۱۔ انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا آف آرٹ۔ جلد ۱۷۔ گرے سٹون پریس نیویارک
۲۔ کلیاتِ اقبال اردو۔ ص ۵۷۶ ۳۔ ایضاً ص ۵۹۰
۴۔ ڈاکٹر فتح پوری : اقبال سب کے لیے ؛ اردو اکیڈمی سندھ۔ کراچی : ص ۱۹۴
۵۔ کلیاتِ اقبال اردو۔ ص ۹۳
۶۔ نصیر الدین ناصر۔ تاریخِ جمالیات۔ مجلس ترقی ادب لاہور
۷۔ نصیر احمد ناصر۔ اقبال اور جمالیات۔ اقبال اکادمی پاکستان
۸۔ میاں محمد شریف : فلسفۂ اقبال
۹۔ اقبال ۸۵ء : مرتبہ ڈاکٹر وحید عشرت : اقبال اکادمی پاکستان
۱۰۔ نبیلہ صمد : اقبال کا نظریۂ فن ؛ مقالہ ایم اے اردو۔ ۱۹۷۲ء
۱۱۔ فن اور مطالعۂ فن : پروفیسر سعید احمد رفیق ؛ قمر کتاب گھر، کراچی : ص ۹
۱۲۔ علی عباس جلالپوری : روایاتِ فلسفہ۔ خرد افروز جہلم۔ ص ۴۳۔۴۲
۱۳۔ کلیاتِ اقبال اردو۔ ص ۶۱
۱۴۔ ایضاً ص ۵۶۲
۱۵۔ ایضاً
۱۶۔ دیباچہ مرقع چغتائی، در مضامینِ اقبال، تصدق حسین تاج حیدر آباد دکن۔ ص ۱۹۷۔۲۰۰
۱۷۔ خودی اور فن : پروفیسر محمد طاہر فاروقی۔ ص ۱۳۹
۱۸۔ تصدق حسین : "شاہینِ اقبال"۔ حیدر آباد دکن
۱۹۔ پروفیسر عزیز احمد : "اقبال کا نظریۂ فن"۔ رسالہ اردو۔ جولائی ۱۹۴۹ء ص ۲۵
۲۰۔ عبدالسلام ندوی : انسانِ کامل : کامران پبلی کیشنز۔ ۱۹۸۸ء
۲۱۔ کلیاتِ اقبال اردو : ص ۵۸۸
۲۲۔ ایضاً ص ۵۸۰

۲۳۔ پروفیسر سعید احمد رفیق ۔ "فن اور مطالعۂ فن" قمر کتاب گھر، کراچی ۱۹۸۸ء۔ ص ۱۰۳

۲۴۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ؛ فکرِ اقبال ؛ بزمِ اقبال لاہور، ص ۷۹۴

---

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006